

اساسیات اسلام

(۵)

تعمیر فرد

یہودیت اور عیسائیت میں ایک مشترکہ نقص استناد (AUTHORITY) میں بچک کا فقدان ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ معاشرہ کی شیرازہ بندی کے لیے استناد کا ہونا ضروری ہے یہ بھی صحیح ہے کہ پہلے پہل استناد ہی نے انسان کو تہذیب و ثقافت کی رنگارنگی سے آشنا کیا ہے لیکن تعبیر و تشریح کے لحاظ سے اس کو بے لوج ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ انسان جس طرح پرچا ہوتا ہے کہ سیاسیات میں اس کا حصہ ہو۔ غیر انبیاء میں اس کی کوششوں کو سراہا جائے۔ اور علوم و فنون کے ارتقا میں اس کی فکری ترکہاؤں کو تسلیم کیا جائے، ٹھیک اسی طرح اس کا یہ تقاضا بھی صحت و معقولیت لیے ہوئے ہے کہ جس دین کو یہ ماننا ہے، جس دین کے لیے اس نے زندگی وقف کر رکھی ہے اور جس دین کو وہ ابدی صداقت کا درجہ دیتا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں اس کی تعبیر و تشریح کا حق بھی اسے حاصل ہو تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ جن تصورات پر یہ ایمان رکھتا ہے وہ ہر دور میں انسانیت کے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ یہاں سوال دراصل صرف شخصی استحقاق کا نہیں، خود دین کی حفاظت و بقا کا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی ذہنی و علمی سطح ہر زمانہ میں برابر بدلتی رہتی ہے۔ خود انسانی معاشرہ بھی ٹھس یا بے جان کیساں ہے۔ اس میں بھی ایک طرح کی زندگی اور ایک طرح کی آرزوئے تکمیل ہے جو اس کو آگے بڑھاتی اور نیت نیا روپ عطا کرتی رہتی ہے۔ ان حالات میں اگر قانون یکسر بے لوج ہو یا استناد کی سنگینی بغیر احوال کا ساتھ نہ دے سکے اور نئی نئی تشریحات کا بخندہ پیشانی استقبال نہ کر سکے تو طبیعتوں میں بغاوت کا پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔

کچھ اسی نوع کی ذہنی مجبوریوں کے پیش نظر مغرب میں مذہب فطرت (Natural Religion) کی بنیاد پڑی۔ فرانس اور انگلینڈ میں خصوصیت سے اس تحریک کو بہت فروغ حاصل ہوا اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ انسانی ذہن کو استناد اور اذعانیت (DOGMATISM) کی بے رحمیوں سے نجات دلائی جائے۔ اس کے موٹے موٹے اصول یہ تھے :

- (۱) اللہ تعالیٰ کو بغیر کسی دینی کتاب کی منت پذیری کے ماننا چاہیے۔
- (۲) اخلاقی قانون اور روحانی اقدار کو عقل اور انسان دوستی کے پیمانوں کے مطابق وضع کرنا چاہیے۔

(۳) تمام وہ دینی حقیقتیں جو عالمگیر ہیں، انسان کے قلب و ضمیر پر پہلے سے فطرت کی جانب سے نقش ہیں۔

(۴) انسان ایک وسیلہ ترمبھائی چاہئے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس بنا پر یہ بجائے خود ایک برادری اور جھگڑا ہے۔ جس کو استناد و اذعانیت کی ستم ظریفیوں نے خواہ مخواہ مختلف کمیوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔

اس کے علمبرداروں میں ژان بودین (JEAN BODIN) بہت مشہور ہے۔ اس نے ۱۵۹۳ء میں مذہب فطرت کے بارے میں بہت کچھ لکھا، جو اگرچہ اس وقت چھپ نہ سکا، تاہم سترھویں اور اٹھارویں صدی کے پڑھے لکھے حلقوں میں ان تحریروں کا خاصہ چرچا رہا، اور ۱۸۴۱ء میں کہیں جا کر ان کا ایک خلاصہ چھپا اور وہ بھی ترجمہ کی صورت میں۔ اس تحریک کا دائرہ اثر کس حد تک وسیع تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۱۵۷۷ء میں ہنری چہام جیسا شخص پکارا اٹھا جو عیسائیت پر سختہ یقین رکھتا تھا کہ جو لوگ دیانت داری سے اپنے ضمیر کی آواز سنتے ہیں، میرے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور میرا مذہب وہی ہے جو تمام اچھے اور باضمیر لوگوں کا مذہب ہے۔

بودین یہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ خدا کا انکار کریں اور مذہب فطرت کی آڑ لے کر خواہشات نفس کی پیروی کرنا شروع کر دیں۔ اس کے برعکس اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ لوگ ڈھلے ڈھلاے

۱۵ ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی۔ بائی، فڈنگ پہلی جلد ص ۷۰

۱۶ ایضاً، ص ۶۲

دینی عقیدوں کو چھوڑ دیں اور بجائے قانون، آئین اور کتاب کے، ضمیر و قلب کی پاکیزگی میں اپنے معبود کو تلاش کریں۔ وہ برملا کہا کرتا تھا کہ تم ”مذہب کے بارہ میں ادھر ادھر کی باتوں کو چھوڑ دو اور اس حقیقت کو مضبوطی سے تھام لو کہ سچے مذہب کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ تم ریح کی تطہیر کے ساتھ اللہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاؤ۔“

دین کو کتابوں کی بجائے سر ہر انسان کے قلب و ذہن پر مرتسم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہر رٹ (HERBERT) کے الفاظ میں دلیل کا اسلوب یہ تھا۔

”اگر ہم سچائی کے ادراک پر قادر ہیں تو ہمارے قلب و ذہن میں اس کے لیے ایسی جھلکتوں کا ہونا ضروری ہے کہ جن کے بل پر ہم سچائی کو پلینے میں کامیاب ہو سکیں۔“

یہ لوگ قلب و ضمیر اور ذہن و فکر کی کاوشوں سے جن نتائج تک پہنچ پائے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بلاشبہ ایک اعلیٰ اور مقدس ذات موجود ہے۔

۲۔ اس ذات کی پرستش ہونا چاہیے۔

۳۔ پرستش کا بہترین طریق نیکی اور پاکیزگی اختیار کرنا ہے۔

۴۔ الحاد اور جرائم سے توبہ کرنی چاہیے۔

۵۔ خیر و شر کا بدلہ آخری زندگی میں ملے گا۔

مذہبِ فطرت کے متعلق ایک صاحب کی یہ تنقید بہت تیکھی بھی ہے اور صحیح بھی کہ مذہب ہے اور نہ فطرت ہے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اس نوع کی ترکیب لفظی کو ہم ایسے تناقض سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کے دونوں جز ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ مذہب ایک قسم کا تعین چاہتا ہے۔ حتمیت کا متقاضی ہے اور استفادہ و حصولِ فیض کے لیے ایسے مصدر و سرچشمہ کی طرف انتساب رکھتا ہے کہ جو شک و ریب کے کانٹوں سے بالکل محفوظ ہے اور فطرت پرستی قوانین اس کے برعکس ایک طرح کی وسعت اور ابہام لیے ہوئے ہیں۔ مزید برآں ان میں حتمیت و اذعان

کے بجائے فکر و تعین کے الجھاد ہیں اور دانش و عقل کے پیدا کردہ شکوک ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ فطرت ایک حد تک ضرور رہنمائی کرتی ہے مگر اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو پاتا کہ جس سے ایک نظام حیات کی تعمیر ہوتی ہے اور زندگی کا ایک متعین نقشہ ابھرتا ہے۔ فطرت مثلاً یہ ضرور بتاتی ہے کہ خیر و شر سے بہتر ہے لیکن اسی خیر کو پیچیدہ اور وسیع تر زندگی کے گوشوں پر ہم کیونکر منطبق کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں فطرت بالکل خاموش ہے۔ فطرت اس حد تک قطعی ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ عدل اور بالخصوص اجتماعی عدل فرد اور معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لیے بہت ضروری ہے لیکن صرف اس سے اگر ہم چاہیں کہ کسی مخصوص نظام کو ترتیب دے سکیں کہ جو جو ر و تہی اور ظلم و استحصا ل کی ہر ہر صورت کا قلع قمع کر دے تو ہمیں کامیابی نہیں ہوگی۔ فطرت کی رہنمائی اس سلسلہ میں صرف اصول کی حد تک ہے۔ ان ضروری تفصیلات و فروع کا استنباط کہ جس سے تہذیب و تمدن کا نگار خانہ بنتا ہے۔ اس میں ہمیشہ بحث و تحقیق کا ہدف رہے گا۔ تعجب ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے وجود کو تو تسلیم کیا ہے مگر اس کے لوازم کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ موجود ہے اور اسی نے دنیا کے اس عظیم ترین مادی نقشہ کو ترتیب دیا ہے تو ضروری ہے کہ وہ ذات گرامی زندگی کے اخلاقی و اجتماعی نقشہ کو بھی مرتب کرے اور وہ انسان جو اس کی ساری کائنات میں منفرد اور مایہ ناز تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی شفقت بے پایاں اور رحمت غیر محدود سے محروم نہ رہے۔ اگر اللہ تعالیٰ خلاق ہے اور اس کے ساتھ پروردگار بھی ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ دشتِ امکاں کو تو سجاوے اور دبستانِ حیات میں گل بوٹوں کی پرورش کا اہتمام تو کرے لیکن اس انسان کی تکمیل و ارتقا کے تقاضوں سے دلچسپی نہ رکھے جس سے اس کی رونق قائم ہے؟ مذہبِ فطرت کے ماننے والوں نے اس نکتہ پر غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کو مان لینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم نے مذہب و دین کی ضرورتوں کو تسلیم کر لیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ماننے کی ضرورت ہی اس بنا پر پیدا ہوتی ہے کہ عقل و استعداد میں محدود انسان اس غیر محدود ذات سے استعانت چاہتا ہے جو اس کی زندگی میں خیل اور کار فرما ہو، جو اس کے قلبی و ذہنی خلفشار سے آگاہ اور اس کی ذہنی نارسائیوں سے آشنا ہو یعنی جو اس لائق ہو کہ اس کے لیے زندگی کی راہوں کو متعین، ہموار اور خوشگوار بنا سکے۔

مذہب فطرت سے اگرچہ ہم متفق نہیں ہو سکتے مگر اس کے پس منظر میں جو روح اور فکر پہنا ہے اس سے انکار نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ استناد کے دائروں کو صرف اسی حد تک وسیع ہونا چاہیئے کہ جس سے تہذیب و تمدن کا خوبصورت اور قابل عمل مرقع تیار ہو سکے۔ اس کو بے جا پابندی، فضول قدغن اور بے معنی طوق و سلاسل کی شکل نہیں اختیار کرنا چاہیئے کہ جس سے خود زندگی گھٹن محسوس کرنے لگے۔ نیز اس کے احکام و فروع میں اس درجہ پک کا ہونا ضروری ہے کہ جس کے بل پر ہر سر در در میں انسان اجتہاد و قیاس کی طرف طرازیوں سے تاریخ کی کمرہ لٹوں کا ساتھ دے سکے۔ ورنہ یہ خطرہ ہے کہ تہذیب کہیں متحجر ہو کر نہ رہ جائے۔

مزید برآں مذہب و دین کے بارہ میں یہ نکتہ باریک تر بھی خاص التفات چاہتا ہے کہ اگر یہ ایسی شاخ در شاخ تفصیلات ہی سے تعبیر ہے کہ جن میں زندگی کے ہر ہر گوشہ اور جزئیہ سے تعرض کیا گیا ہے اور کسی بھی مسئلہ کو نشہ و تکمیل نہیں رکھا گیا۔ تو سوال یہ ہے کہ اس صورت میں فکر و اجتہاد کی تازہ کاریوں کے لیے کیونکر گنجائش پیدا کی جائے گی اور یہ مذہب بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ کیونکر دے سکے گا۔ اس بنا پر ایک صحیح قابل عمل اور متوازن مذہب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں نہ تو اتنا پھیلاؤ ہو کہ جس کو وقت کے تقاضے سمیٹ ہی نہ سکیں اور نہ اس درجہ اختصار ہو کہ جس سے زندگی کا کوئی نقشہ ہی متعین نہ ہو پائے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اعتدال اور سچائی کی راہ ان دونوں کے بین ہیں۔ مذہب جدیدہ میں جس فلسفہ حیات نے فرد کے مسئلہ کو خصوصیت سے اپنا یا ہے وہ وجود (Existence) ہے اس کے حامیوں نے سقراط کے بعد پہلی دفعہ افراد انسانی کی بچپنی اور اضطراب کو فکر و تحقق کا موضوع ٹھہرایا اور کوشش کی کہ انسانی آلام کا باقاعدہ تجزیہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان کی تہ میں کن مجبوریوں کا دخل ہے اور ہم کس حد تک ان مجبوریوں پر قابو پا سکتے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ مذہب و ادیان اور ان تمام اجتماعی اور سیاسی نظریات سے بیزار ہیں کہ جن کی وجہ سے انسانی آلام نہ صرف یہ کہ قطعاً کم نہیں ہوئے ہیں بلکہ اور بڑھے ہیں انھوں نے پہلی عالمی جنگ کی ہولناکیوں کو بخشم خود دیکھا ہے اور اس بات کا اندازہ کیا ہے کہ جہاں بے شمار گردنیں کٹی ہیں، بے شمار خاندان تباہی اور ہلاکت کے غار میں ڈھکیں دیے گئے ہیں۔

اور بے شمار انسان ہوں اور گیہوں کا شکار ہونے کی وجہ سے بے کار اور مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہاں کسی طرح بھی مذہبی و دینی اقدار، سیاسی نظریے اور اخلاقی و روحانی تنظیمیں انسان کو اس خون آشامی سے باز نہیں رکھ سکے۔ بلکہ اُلٹے متاثر ہو گئے۔ ان عالمی اداروں، تنظیموں اور اخلاقی و روحانی قدروں کو اشتعال انگیزی کے لیے استعمال کیا۔ اس صورتِ حال سے وجودیت کے حاجی مفکرین اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی بھی اجتماعی تنظیم اس بات کا خیال نہیں رکھ سکتی کہ ایک انسان، ایک فرد اور ایک شخص کے مسائل کیا ہیں۔ وہ مشکلات و آلام کی کس نوعیت سے دوچار ہے۔ اور کیونکر ایک فرد کی حیثیت سے ان سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ بالکل ایسی اور قنوط کے اس پس منظر نے فکر و نظر کا جو نقشہ ترتیب دیا اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہر انسان کو مذہب و ادیان سے کنارہ کش ہو کر اپنا مستقبل خود تعمیر کرنا چاہیے۔ عالمی اور اجتماعی نظریات سے ہٹ کر اپنی امنگوں اور خواہشوں کا خود احترام کرنا چاہیے اور زندگی کے تضادات میں خود اپنی پسند اور اختیار (Choice) سے ایسا اسلوب اپنانا چاہیے جو زیادہ سے زیادہ سرتوں اور کامرانیوں کو اس کے دامن میں ڈال دینے کا ضامن ہو۔

فلسفہ وجودیت کا دو لفظوں میں خلاصہ یہ ہے کہ اس کے نقطہ نظر سے وجود (Being) اور پسند یا اختیار (Choice) کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ وجود کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی پر شاعرانہ انداز سے ہٹ کر حقیقت پسندانہ غور کیا جاتے اور یہ دیکھا جائے کہ فطرت کے وسیع و عریض کا رخانے میں اس کی آخر اہمیت کیا ہے؟ انسانی زندگی کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ مجرد کم کی یہ ایک حقیر مروج ہے جو لمحہ بھر کے لیے اٹھی اور پھر ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی اور اس کے ساتھ اس کی امنگیں، اولیٰ لے اور تہذیبی و عمرانی نصب العین سب ختم ہو گئے۔ یعنی اس حقیر سی زندگی کا مال جو لمحہ بھر کے لیے سطح وجود پر چمکتی ہے موت یا کامل عدم ہے جس سے دوچار ہونا ہے اور بیچ کھیت ہونا ہے اور ایک شخص یا فرد کی شمع حیات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل کر دینا ہے۔ یہی نہیں اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دینا ہے، اس کی تمام رحوں کا گلا گھونٹ دینا ہے اور ان تمام ذہنی صلاحیتوں فکری و علمی ترقیوں اور کردار و سیرت کی استواریوں کو فنا کے گھاٹ اتار دینا ہے کہ جن

کے بل پر اس نے زندگی کے ان چند اور پسے تلے لمحوں کو بسر کیا۔ موت کو یہ لوگ ایک طرح کا اہمال (Abandonment) تصور کرتے ہیں کہ جس کے پیچھے کوئی منطق، کوئی قاعدہ اور اخلاقیات کا رفرما نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زندگی اور موت کے بارہ میں یہ حقیقت پسندانہ تصور ہی ایسی چیز ہے کہ جس سے غل کا صحیح اسلوب متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس تصور سے دو باتیں بالکل واضح طور پر سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ فطرت کو انسانی زندگی، انسانی تہذیب اور انسانی ترقیات یا امنگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ دوسرے یہ کہ جب صورت حال یہ ہے کہ فطرت انسان کے معاملہ میں غیر جانبدار ہے تو کوئی شخص بھی اس بات کی تکلیف گوارا نہیں کرے گا کہ خواہ مخواہ عالمی تصورات یا دینی عقاید کا بوجھ اٹھائے پھرے۔ اس کو اگر اس مختصر اور بے مقصد زندگی کے چند لمحوں کو خوشگوار بنانا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے ہر ہر نازک موڑ پر اپنے لیے راہ عمل تجویز کرے۔ اس تجویز یا پسند کے معنی یہ نہیں کہ وہ مروجہ اصولوں کی مخالفت کرے یا اس نظام حیات کو جھٹلائے کہ جو معاشرہ میں دائر و سائر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سعی و تگ و دو اور عمل کا اصل محور اپنی اور انسانی ذات ہے۔ قاعدے قانون یا تصورات نہیں، اس لیے جہاں جہاں اس نوعیت کا تضاد پیدا ہو کہ سوسائٹی کچھ چاہتی ہے اور اس کی ذاتی سرشتیں اور ذاتی مفادات کچھ اور چاہتے ہیں تو اس کا فرض ہے کہ خوب دیکھ بھال لے کہ کیونکہ اس تضاد سے غلطی حاصل کر سکتا ہے اور کس طرح اس آب و ہوا میں رہتے ہوئے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سرتوں کی مقدار اپنے دامنِ زیرت میں سمیٹ سکتا ہے۔ (باقی آئندہ)